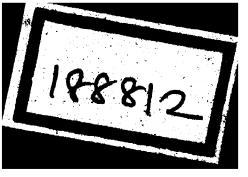
188812

UNIVERSAL LIBRARY

OU_188812

UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۲۰ Accession No. ۱۵۲۲۰
15220

Author [illegible]

Title [illegible]

This book should be returned on or before the date last marked below.

نئے ادب کے معمار

مخدوم محیُ الدین

سردار جعفری

نئے ادب کے معمار

مخدوم محی الدین

از

سردار جعفری

کتب پبلشرز لمیٹڈ
بمبئی

۱۵۲۲۰

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

پہلا ایڈیشن

۱۹۴۸ء

قیمت

پندرہ آنے

فیروز مستری نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳ سے
چھپوا کر کتب پبلشرز لمیٹڈ رنگل بلڈنگ اپولو بندر بمبئی ۱
سے شائع کیا

۱۔ مخدوم۔ سرخ سویرے کا شاعر ۵

۲۔ انتخاب ۳۹

مخدوم

سُرخ سویرے کا شاعر

رات ایک دوست کے گھر دعوت تھی جس میں تین سیلونی، ایک پنجابی، چار گجراتی، ایک بنگالی اور پانچ ہندستانی شریک تھے، اس چھوٹی سی ٹولی میں کئی زبانوں کے ادیب اور فنکار تھے جن میں لنکا کا سب سے بڑا مصور بھی شامل تھا۔ اس کی بنائی ہوئی چند تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔

کھانے کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے

بنگالی مہمان سے گانا سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے ٹیگور کے کئی گیت اور نظمیں سنائیں پھر خود ہی یہ تجویز پیش کی کہ کوئی ایسی چیز گائی جائے جس میں سب شریک ہو سکیں۔ پہلے ٹیگور کا "جن گن من" شروع ہوا۔ ایک ہندستانی اور ایک سیلونی خاتون نے اپنی آواز گانے والے کی آواز کے ساتھ ملا دی۔ کچھ اور لوگ زیر لب گنگناتے رہے۔ بنگالی مہمان نے کہا "اچھا اب ہم اقبال کا ترانہ ہندی گائیں گے۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اب کی گانے والا تنہا تھا۔ اس کی آواز کمرے میں اکیلی پھڑ پھڑا رہی تھی۔ دو تین شعروں کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ پھر یکایک جیسے سوکھی ہوئی ڈالی سے ہری کونپل پھوٹ نکلے اس نے مخدوم کا گیت "جنگ آزادی" چھیڑ دیا۔ کئی آوازیں اور بلند ہوئیں اور دھیمی پڑ گئیں گیت کئی بار شروع ہوا اور کئی بار بیچ سے ٹوٹ گیا۔ آخر کئی کوششوں کے بعد سب ایک ساتھ گانے لگے ؎

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی

سارا کمرہ گونج رہا تھا۔ دیوار پر لگی ہوئی لنکا کی ساکت اور جامد تصویروں کے رنگین ہونٹوں میں بھی جان سی پڑ گئی اور وہ بھی گانے لگیں۔

کھڑکی کے باہر ساحل سے ٹکراتی ہوئی سمندر کی موجوں نے تھوڑی دیر تال دی پھر اس گیت کے مترنم الفاظ کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اجنبی دیس کے اجنبی ساحلوں پر ہندستان کی آواز کو پھیلانے چلی گئیں ؎

ساراسنسار ہمارا ہے — پورب پچھم اتر دکن
ہم افرنگی ہم امریکی — ہم چینی جانبازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن — آہن پیکر فولاد بدن
یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

سمندر کی موجوں کے ہر تھپیڑے میں یہ مصرعے گونج رہے تھے۔ آج سے تین برس پہلے جب مخدوم نے یہ نظم رسالہ نیا ادب کے لئے بھیجی تھی تو لکھا تھا کہ "وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب یہ نظم سارے ہندستان کی زبان پر ہوگی"۔ اس کے ایک سال بعد سبط حسن نے مخدوم کو ایک خط میں لکھا تھا :-

"تمھیں معلوم ہے کہ وہ کون سی نظم ہے جس نے تمھیں ہندستان کے عوام کا محبوب اور مقبول شاعر بنا دیا ہے۔ لاکھوں کسانوں اور مزدوروں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس نظم کا لکھنے والا کون ہے لیکن جلسوں کی جو روداد ہمارے اخبار میں شائع ہونے کے لئے یہاں آتی ہے اس میں اکثر لکھا ہوتا ہے کہ جلسے کی کارروائی "جنگ آزادی" سے شروع ہوئی جسے پانچ لڑکوں کے ایک جتھے نے یا دس لڑکیوں کی ایک ٹولی نے مل

کر گیا۔ شاید نامہ نگار کو بھی اس کی خبر نہیں کہ یہ نظم مخدوم کی ہے۔ قبول عام کی یہ سند ہزاروں ادبی تنقیدوں پر بھاری ہے۔ میں نے خود ایسے کئی جلسوں میں شرکت کی ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ جب گانے والوں کی ٹولی اس بند پر پہونچی ہے کہ ؎

لو سرخ سویرا آتا ہے　　آزادی کا آزادی کا

تو اکثر ایسا ہوا ہے کہ جلسے کے مختلف گوشوں سے یہی مصرعے دہرائے گئے ہیں اور سننے والے خود سنانے والوں میں بدل گئے ہیں "

سبط حسن کے اس بیان پر ہندستان کا ہر گوشہ شہادت دے گا۔ حیدرآباد کے اس گرلز کالج کا تو ذکر بے کار ہے جس میں لڑکیوں نے ایک مستقل "مخدوم کارنر" بنالیا ہے۔ جہاں ہفتے میں ایک بار سب لڑکیاں جمع ہوکر "جنگ آزادی" ہی نہیں گاتی ہیں بلکہ مخدوم کی دوسری نظموں کی بھی تلاوت کرتی ہیں۔ حیدرآباد میں تو خیر مخدوم کی پرستش ہوتی ہے۔ اس کی زبان و قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وہاں کے باشندوں کے دلوں پر نقش ہوگیا ہے۔ لیکن میں نے بنگال میں، چٹ گاؤں میں، کرناٹک کے قصبوں میں، یوپی کے دیہات میں، بمبئی کے مزدور علاقے میں ہر طرح کے آدمیوں کو "جنگ آزادی" گاتے سنا ہے۔

شروع شروع میں مخدوم کا ترانہ سن کر بہت سے جنسی اور نفسیاتی امراض کے شکار عصابی ادیبوں اور شاعروں نے کہا تھا کہ یہ پروپگنڈا ہے۔ اس کا موضوع ابدی نہیں ہے۔ جنگ ختم ہونے کے

بعد کسی کو اس کا ایک لفظ بھی یاد نہیں رہے گا ،، یورپ کی بھیانک جنگ ختم ہوگئی لیکن ہماری جنگ آزادی جاری ہے بلکہ اور زیادہ شدید ہوگئی ہے۔ مخدوم کی نظم آج بھی ہندستان کی فضاؤں میں گونج رہی ہے۔ اس میں انقلاب فرانس کے مشہور ترانے " لامارسیے " کی سی شدت اور بین الاقوامی مزدور تحریک کے گیت " انٹرنیشنل " کا سا جوش وخروش اور اٹھان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو صرف ہندستان کی تحریکِ آزادی نے نہیں بلکہ ساری دنیا کی جنگ آزادی نے متاثر کیا ہے۔ پھر بھی اس میں ہندستان کے دل کی دھڑکن زیادہ تیز ہے۔

ٹیگور کے " جن گن من " میں پہاڑی چشموں کی گنگناہٹ اور آبشاروں کا نغمہ تحلیل ہوگیا ہے جیسے بلور کی طرح چمکتے ہوئے صاف شفاف پانی کی مسلسل دھار پڑ رہی ہو۔ اقبال کے ترانۂ ہندی میں ایک دیا کا سا بہاؤ ہے جس کا پانی ہچکولے کھا کھا کر آگے بڑھ رہا ہو۔ لیکن مخدوم کی " جنگ آزادی " میں آندھیوں کی سنسناہٹ، طوفانوں کا خروش اور تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ اقبال اور ٹیگور کے مقابلے میں مخدوم کی شاعرانہ حیثیت کچھ بھی نہیں۔ وہ دونوں ہمالیہ پہاڑ کی طرح سربلند ہیں جن کے سائے میں کھڑا ہوا مخدوم اپنے ساز پر گا رہا ہے پھر بھی اقبال اور ٹیگور کی نظم اور گیت کا ہندستان چھوٹا اور محدود ہے۔ وہ دنیا کے نقشے میں ایک الگ جغرافیائی وحدت ہے لیکن مخدوم کی جنگ آزادی کا ہندستان وسیع اور بے کنار ہے۔ اس کی سرحدیں کہیں

م ہی نہیں ہوتیں۔ وہ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی آزادی
ے سپاہی صرف ہندستانی نہیں بلکہ امریکی، افرنگی، چینی، روسی
ی ہیں اور اس کی آزادی کے سرخ سویرے کا گلنار پرچم مشرق و مغرب
ں ایک ساتھ لہرا رہا ہے۔ اقبال اور ٹیگور کی نظموں کی محرک ہندستان
قومی تحریک آزادی تھی۔ مخدوم کی نظم کی محرک ساری انسانیت
ین الاقوامی جدوجہد ہے۔

(۲)

میں مخدوم سے پہلی بار ۱۹۴۰ء میں ملا تھا۔ نیا ادب کی ادارت
ے سلسلے میں مخدوم سے خط و کتابت ضرور ہوئی تھی لیکن صورت کبھی
یں دیکھی تھی۔ میں لکھنؤ میں تھا اور مخدوم حیدرآباد میں۔ سبطے اکثر
دوم کا ذکر بڑے پیار سے کیا کرتا تھا

"یار بڑا اچھا دوست ہے وہ"

اس سے زیادہ مجھے مخدوم کے متعلق کچھ نہیں معلوم تھا۔ ایک
ن خبر ملی کہ ریڈیو کے مشاعرے کے سلسلے میں مخدوم لکھنؤ آنے والا ہے
ں نے اور سبطے نے مل کر بہت سے منصوبے باندھے۔ شامیں کہاں گذاریں
لے، راتوں کو کیا کیا دھومیں مچائیں گے۔

میں دو تین دن بعد جنگ، دشمن پروپگنڈے کے سلسلے میں

گرفتار کر لیا گیا۔

میں بنارس سنٹرل جیل میں پڑا ہوا ریڈیو کے مشاعرے کی رات کا انتظار کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ اور جب وہ رات آئی تو میری بے تابی اور زیادہ بڑھ گئی۔ میں بارک کے صحن میں کئی گھنٹے ٹہلتا رہا۔ لیکن ریڈیو کی آواز میں سے نہیں آئی۔ صرف ایک کریہہ صدا تھی جو ساری رات جیل کی دیواروں سے سر ٹکراتی رہی۔

"نالا، جنگلا، بیل، لالٹین سب ٹھیک ہے"

تیسرے دن اتوار تھا۔ یہ قیدیوں کی ملاقات کا دن تھا۔ سبطے اور جاز آنے والے تھے۔ میری آنکھ خلاف معمول بہت سویرے کھل گئی، ملاقات کے دن سبھی قیدی جلدی بیدار ہو جاتے ہیں۔ صبح کے ہلکے دھندلکے میں جیل کے باہر سے آنے والی سنکھ کی آواز تیر رہی تھی۔ روشنی بڑھتی گئی۔ دھوپ دیواروں سے نیچے اتر آئی اور صحن میں پھیل گئی۔ غسل خانے کے سامنے قیدیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ ہفتے بھر کی بڑھی ہوئی داڑھیاں صاف کی جا رہی تھیں۔ بالوں میں تیل ڈالا جا رہا تھا۔ سفید کپڑے پہنے جا رہے تھے۔ بدگلو قیدی بھی گنگنا رہے تھے۔ ہر طرف عید کی سی چہل پہل تھی۔ جیل کی اداسی اور گھٹی ہوئی فضا میں زندگی اور خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

میں نہا دھو کر ہمہ تن اشتیاق بنا ہوا جیل کے پھاٹک پر آیا تو سینکڑوں ملاقاتیوں کے اجنبی ہجوم میں صرف مجاز کی پہچانی ہوئی شکل نظر آئی

سلسلے کا حسب معمول کہیں پتہ نہیں تھا۔ میں کچھ افسردہ سا ہو گیا مگر مجاز کی موجودگی باعث تسکین تھی۔ میں اس طرف بڑھا اور اس سے لپٹ گیا۔ مجاز کے برابر کھڑا ہوا ایک دبلا پتلا سیاہ رنگ کا نوجوان مسکرا رہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے چپکے سے میرے دل میں کہا کہ یہ مخدوم ہے اور میں مجاز کو چھوڑ کر مخدوم سے لپٹ گیا۔

مخدوم بولا کہ "مجاز نے مجھے دھوکا دینے کے لئے ایک سفید پوش قیدی کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ دیکھو وہ آ رہا ہے سردار لیکن میں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ سردار ایسا نہیں ہو سکتا"

مخدوم کی بڑی بڑی چمک دار آنکھیں مسلسل مسکراتی رہیں۔ اس کی نظروں میں عقاب کی آنکھوں کی تیزی تھی۔ آبنوسی چہرہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے تراش دیا ہو۔ اس کے پورے چہرے پر سنگ تراش کی چھینی کے نشانات تھے۔ رخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا سا ابھار، بلند پیشانی سردار ٹھوڑی اور بھنچے ہوئے ہونٹ ایک پختہ کار اور سخت اصولی آدمی کی شخصیت ظاہر کر رہے تھے۔ اس کی آواز میں عزم اور خود اعتمادی تھی، صرف دو چیزیں مخدوم کی شخصیت میں لچک اور لطافت پیدا کر رہی تھیں ایک اس کا تبسم جس سے بھنچے ہوئے ہونٹوں ہی پر نہیں بلکہ سخت لیکن چمک دار دانتوں پر بھی نرمی دوڑ جاتی تھی اور دوسری اس کی تیز نظروں میں گھلی ہوئی محبت جو معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کی آنکھوں کے گلابی ڈوروں سے ٹپک پڑے گی اور اس کی سرمئی رنگ کی شیروانی کو بھگو

دے گی۔

جب مجاز باتیں کرتا اور مخدوم چپ بیٹھتا تو وہ پتھر کا خوبصورت بت معلوم ہونے لگتا تھا جسے کسی سنگ تراش نے دکن کی نیلی پہاڑیوں سے کاٹ کر بنایا ہو۔ لیکن جیسے ہی اس کے ہونٹ بات کرنے کے لئے ایک دوسرے سے الگ ہوتے اور اس کی زبان کھلتی ویسے ہی اس کی ساری ہستی اپنا چولا بدل لیتی تھی اور اس کے گہرے خط و خال سے معصومیت ٹپکنے لگتی تھی، وہ اپنی ساری شخصیت کو سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا پھر بھی بار بار اس کا لاابالی پن ظاہر ہو جاتا تھا حالانکہ اس کی شیروانی کے بٹن ہی نہیں بلکہ کالر کے ہک بھی بند تھے۔ شاید اس کے پیچھے کوئی ہوئے ہیں، نرم لیکن لمبے لمبے بال اس کی چغلی کھا رہے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ مجھ کو مخدوم سے بے تکلف ہوتے دیر نہیں لگی۔ میں نے کہا کہ "تم پر عثمانیہ یونیورسٹی کی پوری چھاپ ہے اور رگوں میں کہیں سے حبشی خون آگیا ہے"

مخدوم نے ہنس کر جواب دیا کہ "میرے جد امجد بلال حبشی رسول اللہ کے صحابی تھے"

(۳)

سال بھر بعد مخدوم سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ نومبر ۱۹۴۱ء میں

لکھنو ریڈیو اسٹیشن نے "نو وارد شعرا" کا تعارف کرانے کے لئے ایک مشاعرہ کیا۔ مخدوم بھی حیدرآباد سے آیا تھا اور ایک ہفتے تک لکھنؤ میں ٹھہرا رہا۔ مشاعرے کی شام ہم نے "قبلۂ رندان جہاں" (جوش) کے ساتھ گذاری اور رات سڑکوں اور اپنے گھر پر۔ اس رات بڑی ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم لوگ سڑکوں پر گھومتے رہے۔ کہیں کہیں دم لینے کے لئے بیٹھ جاتے تھے دریا کے کنارے ایک پُلیا پر مجاز نے اپنی نظم "آوارہ" سنائی۔ "اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں" اس وقت یہ سوال ہم سب کے سامنے تھا۔ ہم زندگی کے نئے راستے ڈھونڈھ رہے تھے۔ نظم ختم ہونے کے بعد دریا کے دوسرے کنارے سے داد ملی۔ ہماری ہی طرح کا کوئی اور آوارہ گرد دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا۔

نصف شب کے قریب ہم گھر واپس آئے۔ مکان کے سامنے کھڑا ہوا بڑا سا املی کا درخت دیو کی طرح جھوم رہا تھا۔ مخدوم نے اس پرانے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر کہا "مجھے طوفان بہت اچھا معلوم ہوتا ہے"

ہم لوگ کمرے کا دروازہ بند کر کے زمین پر فرش بچھا کر بیٹھ گئے۔ دیوار سے لگی ہوئی میز کے نیچے ایک اوندھی ہوئی بالٹی کے پیندے پر تین موٹی موٹی موم بتیاں جل رہی تھیں جن کی وجہ سے میز کا سایہ ترچھا ہو کر دیوار پر بلند ہو گیا تھا اور اسپین کی مجاہد خاتون کی بڑی سی تصویر کو چھونا چاہتا تھا جس کی دونوں مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، سینہ ابھرا ہوا تھا، آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور جوش میں اینٹھے ہوئے

ہونٹ کہہ رہے تھے "موت کی طرف چلو"

یہ تصویر ہماری اس وقت کی جذباتی کیفیات کی ترجمان تھی، ہمارا پورا "نیا ادب گروپ" اسپین کی خانہ جنگی سے بہت متاثر تھا۔ ہم نے اسی زمانے میں اسپین کے شاعر لورکا کی کچھ نظمیں اور نوجوان انگریزی ادیب کاڈویل، ریلف فاکس اور جان کرافورڈ کے حالات پڑھے تھے اور ہمارے دل میں بھی یہ امنگ تھی کہ ان جمہوری ادیبوں کی طرح ظلم، جہالت، شہنشاہیت اور بربریت کے خلاف لڑکر ہم بھی کہیں اپنی جان دے دیں۔ اس خیال میں رومانویت زیادہ تھی۔ جان دینے کے مواقع تو ملے نہیں اور اگر کہیں تھے تو ہم ان تک پہونچ نہیں سکے اس لئے ہم اپنے نچلے درمیانی طبقے کی تمام قدروں کو پیروں تلے روند کر انتقام لے رہے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہی سچی ترقی پسندی ہے اور یہی ہمارے لاابالی پن کا راز تھا۔

باہر ہوا کے سائیں سائیں چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی کبھی دروازے کھڑکھڑا اٹھتے تھے اور کسی دراز سے گذر کر ٹھنڈی ہوا تیر کی طرح آکر لگتی تھی اور ہم اپنے کمبلوں میں سمٹ جاتے تھے۔ کمرے میں ایک ہنگامہ تھا۔ جذبی اپنی نظم موت سنا چکا تھا اور اب ناچ ناچ کر فیض کی نظم "موضوعِ سخن" گا رہا تھا۔

آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر

رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھوں پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

فیض کو اپنی نظم کی اس سے بہتر داد کبھی نہیں ملی تھی۔ فیض کا اداس چہرہ اور کھوئی ہوئی آنکھیں خوشی اور محبت سے چمک رہی تھیں۔ جذبی گاتے گاتے نڈھال ہو گیا۔ مگر محفل اب بھی گرم تھی۔

مجاز چپکے سے کوئی فقرہ کہہ کر زیر لب مسکراتا تھا اور سبطے بار بار ٹھنڈی سانسیں لے رہا تھا۔ مخدوم کے ہاتھوں میں دیوان حافظ کھلا ہوا تھا اور وہ اپنی میٹھی آواز میں لہک لہک کر پڑھ رہا تھا ؎

شاہ شمشاد قداں خسرو شیریں دہناں
کہ بہ مژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں
بر جہاں تکیہ مکن گر قدحے می داری
شادی زہرہ جبیناں خور و نازک بدناں

رات ڈھلنے لگی تھی۔ پچھلا پہر آ گیا تھا۔ موم بتیاں گھل گھل کر موٹے موٹے آدھنوں کے برابر ہو گئیں۔ اسپین کی مہ جفا تون کی تصویر پر موم بتیوں کی جھلملاتی ہوئی روشنی تھرتھرانے لگی۔ کچھ لوگ سو گئے۔ کچھ اونگھنے لگے۔

اس وقت مخدوم کے چہرے پر بلا کی اداسی تھی۔ وہ کچھ کھو سا گیا تھا۔ میں سمجھا کہ مخدوم بھی سونے والا ہے لیکن وہ جاگتا رہا اور خاموش بیٹھا رہا۔ دیوان حافظ اب بھی اس کے سامنے کھلا پڑا تھا لیکن وہ اس

کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں آنکھوں سے اس کے دل کے اندر اتر گئی تھیں اور اس کے چہرے پر عجیب قسم کا درد اور کرب چھوڑ گئی تھیں۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے مخدوم"

اس نے میری طرف دیکھا۔ کوئی جواب نہیں دیا اور بڑی دیر بعد جب لوگ سو رہے تھے، جب موم بتیاں بجھ چکی تھیں، صرف کھڑکی میں سے صبح کا ہلکا نور اندر داخل ہو رہا تھا اور سپانوی خاتون کے اینٹھے ہوئے ہونٹوں پر بکھر رہا تھا تو مخدوم نے اپنا ایک شعر گنگنایا ؎

خلوتِ رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال
جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

وہ مخدوم کے لاابالی پن کی آخری رات تھی۔ آج کا مخدوم مشاعرے والی رات کا مخدوم نہیں ہے۔ اب وہ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر اور حیدرآباد کا سب سے بڑا مزدور لیڈر ہے۔ اسے وہ محاذ مل گیا ہے جہاں فخر کے ساتھ جان دی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے طبقے کے کھوکھلے پن سے اکتا کر بھاگ گیا ہے لیکن اب وہ صرف پرانی قدروں کو پیروں تلے روند کر تسکین حاصل نہیں کر سکتا۔ اسے نئی قدروں کی تلاش ہے۔

اس نے دنیا کے مظلوم محنت کشوں کے جھنڈے کے نیچے آکر دم لیا ہے جس کی چھاؤں میں وہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے ایک

نئی زندگی کی تعمیر کر رہا ہے۔ مخدوم کے سینے میں کاڈویل، ریلف فاکس جان کرانورڈ سب زندہ ہو گئے ہیں۔ لورکا اپنی قبر سے پکار کر کہہ رہا ہے "میں اسپین کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ میں عوام کا دکھ درد نظم کرتا تھا۔ ان کے بھولے بھالے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ پھر بھی میں سیاست سے بھاگتا تھا لیکن سیاست نے میرا پیچھا کیا اور فاشزم کی ایک مہلک گولی نے میری جان لے لی۔ کوئی شاعر سیاست سے نہیں بھاگ سکتا۔"

مخدوم نے خود ہی لاابالی پن نہیں چھوڑا ہے بلکہ اپنے ہم خیال اور ہم عمر ادیبوں کے لاابالی پن کو بھی کم کرنے میں مدد دے رہا ہے۔

حیدرآباد کے جس مشاعرے میں مخدوم موجود ہو اس میں وہاں کا کوئی نوجوان شاعر شراب پی کر آنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ایک مشاعرے میں جب ایک شاعر نشے میں چور لڑکھڑاتا ہوا آیا تو مخدوم نے اس سے کہا کہ "آپ کو نظم پڑھنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔" شاعر کے اصرار پر مخدوم نے مائیکرو فون سنبھال لیا اور اعلان کیا کہ "ایک شاعر عالم سکر میں پائے گئے ہیں اور نظم سنانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ان سے نظم سنانے کی درخواست کی جائے۔" مجمع یہ سن کر ہنس پڑا اور مخمور شاعر لڑکھڑاتا ہوا چلا گیا۔

لیکن مخدوم محتسب نہیں ہے۔ یہ اس کے سارے ساتھی جانتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کو پیار کرتا ہے اور ان کی کمزوریوں پر چیں بہ جبیں ہونے کے بجائے مسکراتا ہے لیکن اس کا ایک اصول ہے

جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا ۔ عوام کا احترام کرو۔ وہ تخلیق کا سرچشمہ ہیں۔ ظالم، صاحب اقتدار اور حکمراں طبقوں نے انھیں علم، ادب، تہذیب اور تمدن کی برکتوں سے محروم کر دیا ہے۔ تم اپنے فن اور شعر کی روشنی لے کر ان کے اندھیرے دلوں میں اترتے ہو۔ وہ پیاسوں کی طرح تمھارے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ انھیں تمھارے شراب کے بھبکوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی زندگی میں کافی غلاظتیں ہیں جنھیں وہ اپنے خون سے دھونے کے لئے اٹھے ہیں ان کا احترام کرو اس طرح تم اپنے شعر اور فن کا بھی احترام کر سکو گے"

یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے نوجوان شاعروں اور ادیبوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو مخدوم سے متاثر نہ ہوا ہو۔ وہاں کا ہر نوجوان ترقی پسند شاعر مخدوم کے انداز میں شعر کہتا ہے اور مخدوم کی طرز میں پڑھتا ہے۔ مخدوم کے ساتھ ان سب کو جتنی محبت اور عقیدت ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۴)

دوسرے دن مخدوم مجھ سے طالب علموں کی تحریک اور حیدرآباد کی غلامی، پستی اور بدحالی پر گفتگو کرتا رہا۔ اس نے مجھے وہاں کی شخصی، استبدادی حکومت کے مظالم کی بہت سی داستانیں اور ان سے متعلق اپنی ایک نظم "دھواں" سنائی ؎

جنتیں خاک پہ جس رات اتر آئی تھیں
بدلیاں رحمتِ یزداں کی جہاں چھائی تھیں
عشرتِ وعیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روحِ جہاں بانی تھی
ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں مری چشمِ گنہ گار نے یہ بھی دیکھا
خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

یہ مخدوم کے مزاج کا خطری انکسار تھا کہ وہ ایک نظم سنا کر چپ ہوگیا۔ میں اس کی تمام نظمیں اسی کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ اس کے پڑھنے کا انداز اتنا دلکش ہے کہ جی ہی نہیں بھرتا۔ اس کے علاوہ مجھے مخدوم کی نظمیں پسند بھی ہیں۔

میں نے پوچھا: "تم نے سامراجی جنگ پر کوئی نظم نہیں کہی؟"

اس نے اپنی چند مطبوعہ نظموں کا نام لیا اور پھر ایک غیر مطبوعہ نظم سنائی ؎

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے

بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلا رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیسا جوانی کا خوں ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

برآمدے کے سامنے املی کے پیڑ کے نیچے مٹی سے کھیلتا ہوا ایک چھوٹا سا بچہ مخدوم کی طرف مڑ کر دیکھنے لگا اور پھر پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ مخدوم نظم ادھوری چھوڑ کر بچے سے کھیلنے لگا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا کہ "جب میں کوئی تخلیقی کام کرتا ہوں تو بالکل تنہائی چاہتا ہوں۔ اس وقت میں اپنی محبوبہ کے وجود کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن بچے میری تنہائی میں کبھی مخل نہیں ہوتے۔ وہ ہر وقت میرے پاس آ سکتے ہیں"
ننھا سا بچہ اپنی ماں کے ساتھ چلا گیا اور مخدوم شعر و شاعری کی

دنیا میں واپس آگیا۔ میں نے کہا کہ "تمھاری نظم میں اُداسی اور قنادگی ہے اس میں انقلابی آگ نہیں ہے"

اس نے کہا "ابھی ایک بند باقی ہے۔ اُسے بھی سن لو۔

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جہاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے
کھل گیا انقلابی پھریرا

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

وہ زمانہ بڑا عجیب تھا۔ یورپ میں سامراجی حکومتوں کو جرمنی کے ہاتھوں شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ سارا یورپ جرمنی کی جھولی میں چلا گیا تھا اور دنیا پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ہندوستان اندر ہی اندر سلگ رہا تھا جنگ چھڑنے پر بمبئی کے مزدوروں نے جنگ کے خلاف بہت بڑی ہڑتال کی تھی۔ سارا ملک برطانوی سامراج کے خلاف اُٹھنے پر آمادہ تھا۔ لیکن قومی رہنماؤں نے اس ابھار اور اُبال کو دبا دیا اور جنگ آزادی کو صرف آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے کی جنگ بنا کر انفرادی ستیہ گرہ شروع کی اور جیلوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ حکومت نے اس سے فائدہ اُٹھا کر ساری قومی تحریک کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ ہزاروں بہترین مجاہد جیلوں کے اندر بند پڑے تھے اور ہر طرف ایک عجیب قسم کی

بے بسی کا احساس طاری تھا۔ مخدوم کی اس زمانے کی تمام نظموں پر اس کا اثر تھا۔

میں نے کہا "مخدوم یہ تو صرف تمھاری خواہش ہے کہ سویرا ہو جائے۔ ورنہ ابھی تو کہیں سویرے کے آثار نہیں ہیں۔ تمھاری نظموں میں درد ہے۔ دکھ ہے تکلیف کا احساس ہے۔ لیکن وہ اعتماد یقین اور حوصلہ نہیں، وہ آن بان اور جوش و خروش نہیں جو انقلابی شاعری کی شان ہے۔ حویلی، دھواں، مشرق، سپاہی۔ ان سب نظموں میں یہی جذبہ ہے۔ نظمیں اچھی ہیں لیکن ان کی اٹھان بھرپور نہیں ہے"

مخدوم کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے بولنے نہیں دیا۔ مثلاً تمھارا یہ شعر ہے ؎

اُداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے
کفن سے منہ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر

اس میں ظلم اور بے انصافی کے خلاف تمھاری شدید نفرت ظاہر ہوتی ہے لیکن اس ظلم و بے انصافی کو ختم کر دینے کا عزم نہیں ہے"

مخدوم نے جواب دیا "میں زماں و مکاں کی قید سے آزاد تو نہیں ہو سکتا۔ جعفری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسی نظمیں کہوں"

ایک اور ترقی پسند شاعر بھی بیٹھا ہوا تھا جو میرا بڑا عزیز دوست ہے۔ اس کے دل و دماغ پر غم کی گھٹائیں چھائی رہتی ہیں اسی لئے جوش نے اسے ٹھٹھرے ہوئے فانی کا خطاب دیا ہے۔ باوجود دوستی اور محبت

کہ میرے اور اس کے ادبی اختلافات بہت زیادہ ہیں۔ ایک بار لڑائی ہوگئی میں نے اس کے گھونسہ مار دیا۔ اس نے ایک گلاس انیٹ کی طرح میری طرف پھینکا جسے مجاز نے اپنی پیٹھ پر روک لیا۔

وہ بول اٹھا " داخلی واردات کے بغیر شاعری ممکن نہیں ہے سیاست اور انقلاب شاعری کے موضوع کبھی نہیں ہوسکتے۔ تم میں شعر کہنے کی بہت صلاحیتیں ہیں۔ مجھے تمھاری نظم طور بہت پسند ہے جس میں یہ شعر ہے ؎

نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یہ شاعری ہے۔ دل کی شاعری ہے۔ اس کا موضوع ابدی ہے تمھارا ایک اور شعر ہے ؎

نوائے درد مری کہکشاں میں ڈوب گئی
وہ چاند تاروں کے سیل رواں میں ڈوب گئی

میں نے کہا کہ " یہ دونوں تو شعر ہیں ہی لیکن یہ بھی شعر ہے اور بہت اچھا شعر ہے ؎

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

تم آخر اس کے شعر ہونے سے کیسے انکار کرسکتے ہو "

ہمارا دوست چراغ پا ہوگیا اور کہنے لگا کہ " تم کندذہن ہو۔ تم اپنے وقت

کے ڈاکٹر جانسن ہو،، پھر مخدوم سے مخاطب ہو کر بولا کہ "جعفری کا پیشہ ہے شاعروں کو خراب کرنا۔ تم اس کے چکر میں آئے تو یہ تم کو لے ڈوبے گا۔ اس کے پاس جذبات تو ہیں ہی نہیں۔ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ قلبی واردات محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ بس بکواس دیتا ہے۔ ایک بار اس نے مجھ سے ایک ایسی کرو ڈ نظم لکھوائی جس پر میں آج تک شرمندہ ہوں۔ جعفری اس نظم کو تم اپنے مجموعے میں شامل کر لو۔"

مخدوم نے نرمی سے کہا کہ "داخلی واردات سے کوئی انکار نہیں کرتا لیکن واردات صرف عورت اور مرد کے جنسی تعلقات تک ہی تو محدود نہیں ہیں کیا تم بھگت سنگھ کے اس وقت کے قلبی واردات کا اندازہ کر سکتے ہو جب اس نے پھانسی کے تختے پر قدم رکھا تھا؟"

اس نے کہا "میں کب کہتا ہوں کہ شاعری صرف جنسیات تک محدود ہے،، لیکن میں نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا کہ "اگر قلبی واردات صرف جنسی اور اعصابی ہیجان ہی تک محدود رہتے تو دنیا کا سب سے بڑا شاعر انسان کے بجائے کوئی کتا ہوتا،،

اس پر لڑائی ہو گئی اور کئی دن تک ہم دونوں کا موڈ خراب رہا۔

لکھنو سے حیدر آباد جانے کے کچھ دن بعد مخدوم نے اپنی مشہور نظم "اندھیرا" کہی جو اس کی شاعری اور زندگی کا ایک بہت بڑا موڑ ہے۔

اس نظم کی جذباتی جڑیں جنگ کے اس سامراجی دور میں پائی جاتی ہیں جس میں قومی رہنماؤں کی ناکارہ سیاست اور برطانوی شہنشاہیت کی سخت گیری نے ہندستان کو کچل دیا تھا لیکن یہ نظم کہی گئی ہے اس دور میں جب روس پر جرمنی کے حملے سے جنگ کے حالات میں ایک انقلابی تبدیلی ہو چکی تھی اور دنیا کی سیاست نے ایک نئی کروٹ بدل لی تھی۔ انسانیت کا قافلہ ایک نئے موڑ پر آ گیا تھا۔ ہندستان میں قومی رہنما جیلوں سے رہا ہو رہے تھے اور ملک کی فضا میں "عوامی جنگ" کا نعرہ بلند ہو رہا تھا اور سب یہ محسوس کر رہے تھے کہ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طرف ترقی پسند قوتیں ہیں جن کی رہنمائی چین اور روس کر رہے ہیں اور دوسری طرف جاپان، جرمنی اور اٹلی کی رہنمائی میں دنیا کی بدترین رجعت پرستی ماضی کے ویرانوں اور کھنڈروں کو برقرار رکھنے کے لئے کیڑوں مکوڑوں کی طرح اُمنڈ رہی ہے۔

"اندھیرا" مخدوم کی سب سے زیادہ مقبول نظم "جنگ آزادی" کا پیش خیمہ تھی۔ اس کا آخری شعر ؎

رات کے ماتھے پہ آندھی ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

مخدوم کی زندگی کی نئی کروٹ اور اس کے راستے کی نئی سمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس میں یہ اعتماد جھلک رہا ہے کہ پرانی دنیا باقی نہیں رہ سکتی جس کے پاس "اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں" اور

نئے عہد کے سورج کو طلوع ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

شاید اس وقت تک مخدوم نے اپنی زندگی میں تبدیلی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کے لئے وہ بہت دن پہلے سے بیتاب تھا اور جس کا اظہار لکھنو کے مشاعرے والی رات کو ہوا تھا۔

(۵)

جون ۱۹۴۲ء میں میں بمبئی چلا آیا اور کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار "قومی جنگ" میں کام کرنے لگا۔ سبطے لکھنو ہی میں رہ گیا تھا اور نیشنل ہیرلڈ میں صحافت کر رہا تھا۔ مخدوم حیدرآباد کے سٹی کالج میں پروفیسر تھا لیکن یہ پُرسکون زندگی اُسے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔

ملک پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مصائب کا شکار تھا۔ ہندستان میں نیا ہنگامہ اور نیا جوش تھا۔ روس میں جرمن فوجیں آگے بڑھ رہی تھیں۔ جاپانی فوجیں برما کو پامال کر کے ہندستان کی سرحد پر چڑھی آ رہی تھیں۔ ہرے بھرے کھیتوں پر قحط کی پرچھائیاں منڈلانے لگی تھیں، چور بازاروں کا بیوپار بڑھنے لگا تھا۔ قومی رہنما جیلوں میں دوبارہ بند کر دیئے گئے تھے۔ کانگرس غیر قانونی جماعت قرار دے دی گئی تھی عوام جوالا مکھی کی طرح ابھرے تھے اور حکومت نے بندوقوں اور سنگینوں سے انہیں کچلنے کا انتظام کر دیا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے

تک آگ لگی ہوئی تھی اور سارا ملک خون میں ڈوب گیا تھا۔ روز پھانسی کے نئے پھندے بنتے تھے اور قربانیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔

اب کی بار جب مخدوم سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا کہ "میں نے کالج سے استعفیٰ دے دیا ہے اور کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن ہو گیا ہوں"۔

مخدوم نے دن رات ایک کر دیا اور حیدرآباد کے نوجوانوں اور مزدوروں کی تنظیم کرنے لگا۔ یہاں سے اس کی شاعری کو نئے موضوع ہی نہیں، اس کے تخیل کو نئی بلندیاں بھی ملیں۔

دو تین برس سے ہندستان کے ترقی پسند شاعروں کی اکثریت خاموش تھی۔ بہت سی پھلجھڑیاں چھوٹ کر بجھ چکی تھیں۔ کچھ نئے شاعر ابھر رہے تھے اور کچھ اعصابی ادب کی تخلیق کر کے فرار کی راہیں ڈھونڈھ رہے تھے۔ اس زمانے میں مخدوم نے اپنی نظم "جنگ آزادی" کہی۔

یہ زمانہ وہ تھا جب درمیانی طبقے کے لال بجھکڑ جرمنی کی فتح کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ قحط کے آثار شروع ہو چکے تھے اور کلکتے اور چٹ گاؤں پر جاپانی بمباری ہو رہی تھی۔ جرمن فوجیں استالن گراڈ تک بڑھ آئی تھیں اور قفقاز کو عبور کر کے ایشیا میں گھسنا چاہتی تھیں۔

اس عالم میں مخدوم کی معرکۃ الآرا نظم "استالن" کی آواز آئی۔ یہ مخدوم کی شاعری کا سب سے بلند مقام ہے۔ کہنے کو تو یہ نظم قازقستان کے بوڑھے شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ

یہ مخدوم کے دل کا نغمہ ہے جس کو چھیڑنے میں جمیول جابر نے مدد دی ہے

ہاں مرے ہم وطنو
جاؤ اور اپنے سمندوں کو تو ہمیز کرو
سرخ فوجوں میں ملو
جوئے پر جوش بنو برق کا سیلاب بنو اور پھر
اک دہکتے ہوئے پگھلے ہوئے لوہے کا سمندر بن کر
غضب آلود بھنور بن جاؤ
اور فواشسٹ نغازیر کو
فی النار کرو۔

اس نظم کا ابال کچھ بڑا طوفانی تھا۔ ایسے تیرہ و تار زمانے میں مخدوم کی رجائیت حیرت خیز تھی۔ لیکن یہ اس اعتماد سے پیدا ہوئی تھی جو ایک کمیونسٹ کو عوام پر ہوتا ہے۔ عوام قوت کا بے پناہ ذخیرہ ہیں وہ اپنے منظم عمل سے صرف دشمن ہی کو پیچھے نہیں ہٹا سکتے بلکہ تاریخ کی رفتار کو بھی بدل سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مخدوم میں یہ اعتماد حوصلہ اور یقین پیدا ہوا کہ برطانوی سامراج کے خونیں مظالم اور بنگال کے ہولناک قحط کے باوجود ہندستانی کچلے ہوئے اور نیم جان ہندستانی اس قوت سے اٹھیں گے کہ برطانوی اقتدار کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ یہی اعتماد اور یقین تھا جس نے مخدوم کو یہ کہنے کی بھی ہمت عطا کی کہ جرمن فوجیں آخر کار سوویت یونین کی مزدور سرزمین سے نکال دی جائیں گی۔

ایک مہینے میں جنگ کا رُخ پلٹ گیا اور وہ جرمن فوجیں جو آندھی اور طوفان کی طرح یوکرین کے ہرے بھرے میدانوں سے گذر کر اسٹالن گراڈ پر ٹوٹ پڑی تھیں، مچھروں کی طرح منتشر ہو گئیں اور فاشزم کے درندے کی کمر ٹوٹ گئی۔

مخدوم اپنی نئی نظمیں کہنے کے بعد بمبئی آیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر میں، مہمان سوویت کی انجمن میں، مدن پورے کے مزدور علاقے میں وہ اپنی نظمیں کئی دن تک سناتا رہا اور گانے والوں کی ٹولیوں کو "جنگ آزادی" کی دُھن سکھاتا رہا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کی زندگی کا تضاد دور ہو چکا تھا۔ وہ عوام کے سمندر میں جا ملا تھا اور اب ایک بیتاب اور خوبصورت موج کی طرح طرارے بھر رہا تھا۔

میں نے مخدوم سے کہا کہ "تمھاری نظمیں لوگوں کو بہت پسند ہیں۔ ان کو سُن کر حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور دل میں نئی امنگ پیدا ہوتی ہے"

مخدوم اپنے دلنشیں انداز میں مسکرا دیا۔ میں نے کہا کہ "تمھاری پرانی نظموں میں نہ یہ حسن تھا نہ یہ جوش اور اُبال۔ ان نظموں نے وہ کمی پوری کر دی ہے"

اس نے جواب دیا کہ "ہاں میں پہلے عوام سے دور تھا اور درمیانی طبقے کی بزدلی اور قنوطیت کا شکار تھا۔ اب میری جڑیں زمین میں ہیں اور میرے پاس انسپریشن کی کمی نہیں ہے"

مخدوم اپنی نظمیں کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری جوشی کو سُنانے

کے لئے بیتاب تھا لیکن جوشی کو فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ باقی ساتھی آکر مخدوم سے فرمائش کرتے تھے اور کئی کئی بار سے سنتے تھے۔ لیکن مخدوم جھلایا ہوا تھا۔

ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ ایک نوعمر سے ساتھی نے مخدوم کے پاس آکر پوچھا "کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں" مخدوم نے جواب دیا

"ہمیں اپنی نظم جنگ آزادی سناؤ گے؟"

"نہ سناؤں گا تو کروں گا کیا؟"

"آؤ دوسرے کمرے میں چلو"

وہاں اور بھی کئی ساتھی آ گئے۔ مخدوم اپنی نظم سنا کر باہر نکل آیا۔ اس نے بہت افسردہ ہو کر ایک ساتھی سے کہا کہ "سب نے میری نظمیں سنیں لیکن جوشی نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا"

"اور ابھی تم کسے نظم سنا کر آئے ہو؟"

"کیا وہ جوشی تھے؟"

"اور کیا"

مخدوم شرمندہ ہو گیا۔ جوشی سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔

جب جوشی کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو کہا کہ "شاعروں کا زیادہ خیال کرنا چاہیے۔ وہ نازک مزاج ہوتے ہیں نا"

مخدوم روز بروز مزدوروں کے کام میں ڈوبتا گیا۔ اس نے اپنا دل

دماغ، روح سب کچھ مزدور تحریک کو دے دیا۔ اس نے یہ راز جان لیا تھا کہ دنیا کو منظم مزدور طبقے کی جد و جہد کے سوا اور کوئی چیز نجات نہیں دلا سکتی، اب اسے صرف ایک دُھن تھی۔ مزدور تحریک کی تنظیم۔ حیدرآباد کی شخصی استبدادی حکومت سے نجات۔ ہندستان کی آزادی۔ مخدوم کی شاعری جب اپنے شباب پر آرہی تھی تو وہ عملی کام میں اتنا غرق ہوگیا کہ اُسے شعر کہنے کی فرصت نہیں رہ گئی۔ اُسے کھانا کھانے کا وقت بھی مشکل سے ملتا تھا۔

اس کے بعد جب کبھی مخدوم سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اب آرٹ اور ادب کی باتیں ذرا کم کرتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں سے زیادہ مزدوروں، کسانوں اور ان کے بچوں کی باتیں کرتا ہے۔ وہ غریبوں کی زندگی کی طویل داستانیں سناتا تھا۔ مزدوروں کے بے پناہ خلوص کی قصیدہ خوانی کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھ سے پوچھ لیتا تھا "کوئی نظم کہی ہے؟" اور پھر دوسری باتیں کرنے لگتا تھا۔

اکثر ہمارے اخبار "قومی جنگ" پر اس کی تنقیدیں بہت سخت ہوتی تھیں اور خصوصیت کے ساتھ ادبی صفحے پر۔ "تم لوگ بڑی مشکل زبان لکھتے ہو۔ مزدور اسے نہیں سمجھتا۔ مزدوروں کے پاس جاؤ اور ان سے سیکھو ان کا انداز بیان بڑا سیدھا سادا اور موثر ہوتا ہے"

اب مخدوم کے نزدیک ہر چیز کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تحریک آزادی کو تقویت پہونچانا۔ اسی لئے اردو کے نام نہاد ترقی پسند

ادیبوں سے وہ بہت خفا تھا جن کے لئے ان کی ذاتی ناکامیاں بہت بڑا مسئلہ بن گئی ہیں۔ جوش سے بھی اسے اکثر یہ شکایت رہی کہ وہ ادب کی صحیح امامت نہیں کر رہے ہیں۔

جب کیفی کی نظمیں ہمارے اخبار میں چھپنے لگیں تو مخدوم کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ایک دن میں نے اسے کسی کا بہت اچھا شعر سنایا۔ وہ پھڑک اٹھا "جب میں کوئی اچھا شعر سنتا ہوں تو اتنی خوشی ہوتی ہے جیسے یہ شعر میں نے ہی کہا ہے۔ ادب کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہے یہ اجتماعی میراث ہے"

ایک بار میں نے پوچھا کہ تم نے شعر کہنا کیوں ترک کر دیا ہے"

"دن رات مزدوروں میں کام کرنے کے بعد اتنی فرصت نہیں ملتی شام کو بہت تھک جاتا ہوں کبھی کبھی شعر کہنے کی خواہش بڑی شدید ہوتی ہے لیکن مزدور تحریک میں کام کرنا زیادہ ضروری ہے۔ میں نے بہتر اور مفید چیز کا انتخاب کر لیا ہے"

کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے اپنا سلسلۂ کلام پھر شروع کیا "میں نے اس زمانے میں جو تجربہ حاصل کیا ہے اس نے مجھے روحانی بالیدگی دی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ ڈالوں۔ وہ بہت مفید ہوں گی۔ شاعری کی طرف میں پھر واپس آؤں گا لیکن ابھی نہیں۔ میں حیدرآباد کی تحریک کو بیچ میں نہیں چھوڑ سکتا"

عوام میں آزادی کی جدوجہد کے لئے کام کرنے کے بعد مخدوم

کا ذاتی برتاؤ اور اخلاق کا معیار بھی بدل گیا ہے۔ اب اس میں دکھاوا نام کو باقی نہیں۔ صرف خلوص ہی خلوص ہے۔ جب میں پہلی بار حیدرآباد گیا تو میرا خیال تھا کہ وہ اسٹیشن پر ضرور آئے گا۔ لیکن اسٹیشن پر اور بہت سے احباب تھے مخدوم نہیں تھا۔

میں نے پوچھا "مخدوم کہاں ہے"

کسی نے جواب دیا "سکندرآباد کے ٹریڈ یونین آفس میں"

شام کو مخدوم آیا۔ گرد میں اٹا ہوا۔ اس نے دن بھر نہ ملنے کی معذرت تک نہ کی۔ صرف اتنا پوچھا "کوئی تکلیف تو نہیں ہے" اور پھر حیدرآباد کی تحریک اور اردو کانفرنس کے متعلق باتیں کرنے لگا۔

ہم ایک بہت بڑے محل میں ٹھہرے تھے۔ مخدوم نے بڑے بڑے خوبصورت وارڈ روب کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے پوچھا "کتنے کپڑے لائے ہو" میرے پاس صرف دو تین جوڑے تھے۔ مخدوم خوب ہنسا۔ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ حیدرآباد میں بہت اچھے محل ہیں۔ انقلاب کے بعد کام آئیں گے"

"ہاں کچھ مزدوروں کے کلب بن سکتے ہیں باقی محلوں کو ڈھا کر نئے محل بنانے پڑیں گے۔ یہ عمارتیں بڑی بدصورت ہیں"

جس شخص کے ارادے اتنے خطرناک ہوں وہ حضور نظام اور حیدرآباد کے جاگیرداروں کی نیند اڑا دینے کے لئے کافی ہے۔ مزدور بستیوں کے بعد سب سے زیادہ مخدوم کا چرچا جہاں ہوتا ہے وہ بنجارہ ہل

کے جاگیرداروں اور حکام کی کوٹھیاں ہیں۔ مخدوم کا بھوت ان کے آراستہ کمروں میں اپنے گرد آلود پیروں سے چلتا رہتا ہے۔ اس کی خوفناک چھاپیں ان کے چھلکتے ہوئے جاموں پر پڑتی ہے اور کیا تعجب ہے کہ وہ رات کو خواب میں مخدوم کی صورت دیکھ کر ڈر جاتے ہوں۔

حیدرآباد میں مخدوم سے یا تو محبت کی جاتی ہے یا نفرت۔ کوئی بےغیر جانب دار نہیں ہے۔ نفرت کرنے والوں کا گروہ چھوٹا ہے لیکن طاقتور ہے۔ محبت کرنے والوں کا گروہ بہت بڑا ہے اور مستقبل کی دنیا کا مالک ہونے والا ہے۔ لیکن نفرت کرنے والے بھی مخدوم کی ذاتی زندگی پر انگلی نہیں اٹھا سکتے انھیں مخدوم کے خلوص اور ایمان داری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے ضمیر کی تیرگی کو بھوٹی ہمدردی میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں جب انھیں شراب پیتے پیتے مخدوم کا خیال آجاتا ہے اور ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں تو وہ آپس میں کہتے ہیں "کالج میں اچھا خاصا پروفیسر تھا۔ اب دیکھو چیتھڑے لگائے پھر رہا ہے"

مخدوم نے حیدرآباد کی تحریک کی تعمیر جس خلوص اور جانفشانی سے کی ہے اس کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہوگئے ہیں۔ ان قصوں کے سننے والے مخدوم کا احترام کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

وہ بیمار تھا اور سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے انجکشن تجویز کئے تھے لیکن مخدوم کے پاس روپیہ نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ اسے اپنی ذات پر

خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کیونکہ خود تحریک کو بہت روپے کی ضرورت تھی اور آمدنی کے ذرائع محدود۔ ایک دن کسی دوست نے انگلشن خرید کر دے دیئے۔ مخدوم نے انھیں دکان پر جا کر بیچ ڈالا اور سارا روپیہ تحریک پر صرف کر دیا۔

اس کے بعد اگر حیدرآباد میں مخدوم کا احترام پرستش کی حد تک کیا جاتا ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

ایک صاحب ہیں جنھوں نے مخدوم کو صرف دور سے دیکھا ہے وہ اس کے اتنے گرویدہ ہیں کہ اپنی وضع ویسی ہی بنالی ہے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ مخدوم کا وزن ان کے وزن سے کم ہے تو انھوں نے فاقے کر کر کے اپنا وزن گھٹا لیا۔

خیر یہ تو درمیانی طبقے کے بعض حضرات کا اندازِ محبت ہے جن میں سے مجنوں اور اعصابی ادیب پیدا ہوتے ہیں۔ عوامی محبت کا اظہار دوسری طرح ہوتا ہے کیونکہ وہاں عمل ہی سب کچھ ہے۔

ایک دن مخدوم تقریر کر رہا تھا۔ کوئی دس ہزار کا مجمع تھا۔ شہر میں اس کی گرفتاری کی خبریں اُڑ رہی تھیں۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد مجمع بیٹھا رہا۔ مخدوم نے وجہ دریافت کی تو لوگوں نے بتایا کہ "ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے ورنہ حکومت آپ کو گرفتار کرے گی"۔ لاکھ سمجھایا لیکن لوگ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

مخدوم پریشان ہو گیا "اچھا آپ یہاں بیٹھے رہیے میں جاتا

ہوں۔"

سارا مجمع مخدوم کے ساتھ ہولیا۔ اس نے ایک ساتھی کے مکان پر پہونچ کر کہا کہ "مجھے آپ نے گھر پہونچا دیا۔ اب جائیے" لیکن کوئی واپس جانے پر تیار نہیں تھا۔ وہ سب کھڑے ہوئے گا رہے تھے ؎

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

کیا اس محبت اور عقیدت کی گہرائیاں ناپی جاسکتی ہیں؟

کرشن چندر نے حیدرآباد کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس سے متاثر ہوکر اپنا مشہور رپورتاژ "پودے" لکھا۔ اس میں سب کا ذکر ہے لیکن مخدوم کا نام تک نہیں۔ اس کا سبب کرشن نے یہ بتایا کہ "مخدوم پودے حیدرآباد پر چھایا ہوا ہے۔ میں اس کا ذکر کرتا تو پھر اور کسی کا ذکر نہیں کرسکتا تھا"

یہ حقیقت ہے کہ مخدوم کی شخصیت حیدرآباد پر چھا گئی ہے۔ نظام کی حکومت اس شخصیت سے ڈرتی ہے کیونکہ یہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی شخصیت ہے جس کو ہزاروں منظم مزدوروں اور نوجوان طالب علموں کی تحریک نے جنم دیا ہے۔ نظام کی حکومت نے اس شخصیت کو کچلنے کے لئے مخدوم اور اس کے دوسرے کارکن ساتھیوں کے خلاف وارنٹ جاری کردیئے ہیں۔ حیدرآباد کمیونسٹ پارٹی، آندھرا کانفرنس اور ٹریڈ یونین کانگرس کو غیر قانونی جماعتیں قرار دے دیا ہے اور ہندستانی

کمیونسٹ پارٹی کے اخبارات اور کتابوں کا داخلہ حیدرآباد میں ممنوع قرار دے دیا ہے۔

لیکن یہ شخصیت کچلی نہیں جا سکتی کیونکہ یہ تنہا مخدوم کی نہیں بلکہ ساری دنیا کے محکوموں اور مجبوروں، مزدوروں اور دہقانوں کی شخصیت ہے جو پورے کرۂ ارض پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے متعلق مارکس اور اینگلز نے ۱۸۴۷ء میں اپنی مشہور کتاب کمیونسٹ مینی فسٹو میں لکھا تھا کہ "یورپ کے سر پر ایک سایہ منڈلا رہا ہے کمیونزم کا سایہ" سو برس کی مدت میں وہ سایہ پورب پچھم اتر دکن چاروں طرف پھیل گیا ہے پھر "ممالک محروسۂ سرکار عالی" اس سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔

آج مخدوم اور اس کے ساتھی روپوش ہو کر حیدرآباد کی عوامی تحریک آزادی چلا رہے ہیں۔ وہاں کے کسان اور مزدور ہتھیاروں سے لڑ رہے ہیں۔ ایک ضلع میں مارشل لا بھی جاری ہوا۔ بہت سی خون کی ندیاں بہہ چکی ہیں اور ابھی بہت سی خون کی ندیاں بہیں گی۔ مخدوم نے چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنا بند کر دی ہیں۔ اب وہ ایک عظیم الشان رزمیہ لکھ رہا ہے جس کے تار و پود تلنگانہ کے چالیس لاکھ کسان اپنے خون سے تیار کر رہے ہیں۔ یہ اس کا شاہکار ہوگا

دسمبر ۱۹۴۶ء

انتخاب

اندھیرا
جنگ آزادی
اسٹالین
انقلاب
ٹوٹے ہوئے تارے
حویلی

اندھیرا

رات کے ہاتھ میں اِک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا ــــ کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ

وہ تہذیب کے زخم
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
مینتیں ہاٹ کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اِس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی

چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

جنگ آزادی

یہ جنگ ہے جنگ آزادی — آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی — محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی — دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی — آزادی کے پرچم کے تلے
سارا سنسار ہمارا ہے — پورب پچھم اُتر دکّھن
ہم افرنگی ہم امریکی — ہم چینی جانبازانِ وطن

ہم سرخ سپاہی ظلم شکن　　آہن پیکر فولاد بدن
یہ جنگ ہے جنگ آزادی　　آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی　　محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی　　دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی　　آزادی کے پرچم کے تلے
وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا؟　　دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دنیا دنیا کیا ہوگی؟　　جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی، آزادی کیا؟　　مزدور کا جس میں راج نہ ہو
یہ جنگ ہے جنگ آزادی　　آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی　　محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی　　دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی　　آزادی کے پرچم کے تلے

لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے آزادی کا آزادی کا
یہ جنگ ہے جنگ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

استالین

صفِ اعداء کے مقابل ہے ہمارا رہبر
اسٹالین
مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں
وہ زمیں اور وہ وطن
جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو

جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرق
اُن کی محنت کا اخوت کا محبت کا خمیر

وہ زمیں
اس کا جلال
اس کا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا مجاہد نہ بنوں؟
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
میرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر
ایسے ہنگامِ قیامت میں میرا نغمۂ شوق
کیا مرے ہم وطنوں کے دل میں

زندگی اور مسرت بن کر
نہ سما جائے گا؟
قرۃ العین! میری جان عزیز
ادھر اے فرزند!
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالین

وہ مرا ملک جہاں
وہ مرا بادۂ احمر کا جواں سال سبو
مری نوخیز مسرت کا جہاں

وہ مرا سرو رواں ملک جواں
دلِ الجرم خطا کار درندوں نے جہاں
اپنے ناپاک ارادوں سے قدم رکھا ہے
ایک نوخیز کلی — ایک نو آغاز بشر
وہ مرا ملک جواں
سچ کہا ہے "کہ زمیں کے کیڑے
اپنی بے وقت اجل سے ڈر کر
تھرتھراتے ہوئے سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے
نکل آئے ہیں بلوں سے باہر"
اپنے فولاد سے روزن کے دہن بند کرو
اور فاشسٹ شغالوں سے کہو
نغمۂ اول و آخر ہے یہی

قرۃ العین! مری جانِ عزیز

او مرے فرزندو!

برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا

تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا

مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے

ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالین

یہی محشر ہے، دو عالم کا تصادم ہے یہی

ایک پرانا عالم

ایک نیا

ایک مرتی ہوئی بڑھیا کا لنگڑاتا ہوا پاؤں

ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں

دوسرا۔ ایک اُبھرتے ہوئے سینے کا شباب
تیز اور تند شراب
پیٹ سے رینگنے والے، یہ نجس اور ناپاک
سوسمار
دورِ وحشت کے درندے
موذی
دہن آز و ہلاکت کا شکنجہ لے کر
مرے شاہیں کے خلاف
رات دن ہیں کہ چلے آتے ہیں
نہیں جائیں گے کبھی رائگاں میرے نغمے
اور مرے ہم وطنوں کے نغمے
مرے شاہین تو منصور و مظفر ہی رہیں گے دائم

سو سماران خیزندہ در گور

مرا شاہین، مرا استالین

مرے شاہین بچے، جن کا ابھی نام نہیں

سرخرو اور سرافراز فضاؤں میں بلند

ہاں مرے وطنو

جاؤ اور اپنے سمندوں کو توہمیز کرو

سرخ فوجوں میں ملو

جوئے پرجوش بنو، برق کا سیلاب بنو اور بہو

اِک دہکتے ہوئے پگھلے ہوئے لوہے کا سمندر بن کر

غضب آلود بھنور بن جاؤ

اور فاشسٹ خنازیر کو

فی النار کرو

مرے بلخاش کہاں ہے وہ مس سرخ ترا
اُس سے کہنا سرِ دشمن پہ گرے "شل" بن کر
بحرِ اخضر کے او ماہی گیرو! غوطہ زنو
اپنا ذخیرہ لاؤ
اور قربانِ وطن کر ڈالو
معدنوں سے کہو اور کھیتوں کو آواز تو دو
لائیں وہ اپنے سن و سال کا حاصل لائیں
اور قربانِ وطن کر ڈالیں
یہ ہیں رہوار، یہ پشمینہ ہے یہ خرمن ہے
مرے محبوب وطن
سب کے سب تیرے ہیں سب تیرے ہیں
ایستالین نے میدان میں بلایا ہے ہمیں

کسب اور جہد کا پیغام سنایا ہے ہمیں
خطۂ قدس سے دشمن کو نکالو باہر

قازقستان!

وطن!

اپنی طاقت کو سمیٹے ہوئے اُٹھ
خیز با صد حشم و جاہ و جلال
بہ ہزاراں جبروت
ایک جان ایک جسد
پھونک دے دشمن ناپاک کی خاکستر کو

انقلاب

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہ گذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

نہ تابناکی رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفن ہوائیں سب مسموم
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

رخ حیات پہ کاکل کی برہمی ہی نہیں
نگار دہر میں انداز مریمی ہی نہیں
مسیح و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے
قفس میں بند ترے ہم صفیر ہیں کب سے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک
سروں میں دین کا سودائے خام ہے اب تک
توہمات کا آدم غلام ہے اب تک
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

ابھی دماغ پہ قحبائے سیم و زر ہے سوار
ابھی رگ ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار
شمیمِ عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

ٹوٹے ہوئے تارے

نوائے دردمری کہکشاں میں ڈوب گئی
وہ چاند تاروں کی سیلِ رواں میں ڈوب گئی

سمن برانِ فلک نے شرر کو دیکھ لیا
زمین والوں کے دل کو نظر کو دیکھ لیا

وہ میری آہ کا شعلہ تھا کوئی تارہ نہ تھا
وہ خاکداں کا مسافر تھا ماہپارہ نہ تھا

دلوں میں بیٹھ گیا تیرِ آرزو بن کر
فلک پہ پھیل گیا عشق کا لہو بن کر

یہ ساکنانِ فلک درد و غم کو کیا جانیں؟
یہ خاکیوں کی رہ بیش و کم کو کیا جانیں؟

وہ غم کو پی تو گئے آنسوؤں کو پی نہ سکے
زمیں کے زہر کو پی کر وہ اور جی نہ سکے

فلک سے گرنے لگے ٹوٹ ٹوٹ کر تارے
زمیں پہ ڈھیر ہوئے تیرِ آہ کے مارے

یہ آگ اور بھی اوپر نکل گئی ہوتی
حریمِ عرش کو چھو کر نکل گئی ہوتی

حویلی

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج
اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر
مار و کژدم کا ٹھکانا جس کی دیواروں کے چاک
اُف یہ رخنے کس قدر تاریک کتنے ہولناک

جن میں رہتے ہیں مہاجن جن میں بستے ہیں امیر
جن میں کاشی کے برہمن جن میں کعبے کے فقیر
رہزنوں کا قصر شوریٰ۔ قاتلوں کی خواب گاہ
کھل کھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ
جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا ایمان کا
روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا
زیست کو درسِ اجل دیتی ہے جس کی بارگاہ
قہقہہ بن کر نکلتی ہے جہاں ہر ایک آہ
سیم و زر کا دیوتا جس جا کبھی سوتا نہیں
زندگی کا بھول کر جس جا گذر ہوتا نہیں
ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال
خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال

ایک جانب ہیں وہیں ان بے نواؤں کے گروہ
ہاں انھیں بے نان و بے پوشش گداؤں کے گروہ
جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنّا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال
اے خدائے دو جہاں اے وہ جو ہر اک دل میں ہے
دیکھ تیرے ہاتھ کا شہ کار کس منزل میں ہے
جانتا ہوں موت کا ہم ساز و ہمدم کون ہے
کون ہے پروردگارِ بزمِ ماتم کون ہے
کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں ملبوسِ دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روحُ الامیں
اے جواں سالِ جہاں جانِ جہانِ زندگی
سارباںِ زندگی رُوحِ رواںِ زندگی

جس کے خونِ گرم سے بزمِ چراغاں زندگی
جس کے فردوسی تنفس سے گلستاں زندگی

بجلیاں جس کی کنیزیں زلزلے جس کے سفیر
جس کا دل خیبر شکن جس کی نظر ارجن کا تیر

ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی
تو بجائے سازِ الفت اور گائے زندگی

آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں
آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

مکتبۂ ذوقیہ

نئے ادب کے معمار

پچیس کتابوں کا سٹ

۱۔ سجاد ظہیر از ڈاکٹر محمد اشرف
۲۔ کرشن چندر از خواجہ احمد عباس
۳۔ عصمت چغتائی از سعادت حسن منٹو
۴۔ سعادت حسن منٹو از کرشن چندر
۵۔ اختر رائے پوری از دیوندر ستیارتھی
۶۔ راجندر سنگھ بیدی از کنہیا لال کپور
۷۔ اوپندر ناتھ اشک از راجندر سنگھ بیدی
۸۔ احمد عباس از عصمت چغتائی
۹۔ اختر اورینوی از سہیل عظیم آبادی
۱۰۔ دیوندر ستیارتھی از ساحر لدھیانوی
۱۱۔ ممتاز مفتی از فکر تونسوی
۱۲۔ فراق گورکھپوری از مجنوں گورکھپوری
۱۳۔ اسرار الحق مجاز از عصمت چغتائی
۱۴۔ فیض احمد فیض از پطرس
۱۵۔ ن۔م۔ راشد از ؟
۱۶۔ سردار جعفری از کرشن چندر
۱۷۔ مخدوم محی الدین از سردار جعفری
۱۸۔ احمد ندیم قاسمی از ساحر لدھیانوی
۱۹۔ معین احسن جذبی از اسرار الحق مجاز
۲۰۔ جان نثار اختر از سبط حسن
۲۱۔ کیفی اعظمی از سجاد ظہیر
۲۲۔ ساحر لدھیانوی از کیفی اعظمی

۲۳
شاعرِ انقلاب جوش
از
احتشام حسین

۲۴
پریم چند
از
سجاد ظہیر

۲۵
تین شاعر
(ساغر۔ اختر۔ حفیظ)

کتب پبلشرز لمیٹڈ۔ بمبئی ۱